خطاب: مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی رحمۃ اللہ علیہ قسط: اوّل

وحدتِ اُمّت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَ کَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

میرے بزرگو اور دوستو! یہ امر ایک حقیقت ہے، اس میں کسی تواضع کا دخل نہیں کہ ابتداءِ عمر سے نہ کبھی کوئی خطیب رہا نہ واعظ اور نہ بڑے مجمعوں کو خطاب کرنے کا عادی۔ میری پوری عمر پڑھنے پڑھانے میں گزری یا پھر کچھ کاغذ کالے کرنے میں۔ عام مسلمانوں کی ضرورت کے مطابق مختلف رسائل پر تصنیف کا سلسلہ رہا اور میرے بزرگوں نے اپنے حسنِ ظن سے خدمتِ فتویٰ میرے سپرد فرما دی۔ عمر کا ایک بہت بڑا حصہ اس میں صَرف ہوا۔

ہمارے محترم حکیم عبدالرشید اشرف صاحب نے اپنے حسنِ ظن اور کرم فرمائی سے مجھے یہاں لا بٹھایا اور جو عنوان مجھے کلام کرنے کے لیے حوالہ فرمایا، وہ جس طرح اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایسا یقینی اور واضح ہے کہ اس میں دو رائے ہونے کی کوئی گنجائش نہیں۔ اسی طرح ہمارے معاشرے میں اس کا وجود ایسا کمیاب ہے کہ اپنے معاشرہ کو سامنے رکھتے ہوئے اس موضوع پر زبان کھولنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ مجھے عنوان یہ دیا گیا ہے کہ اُمتِ اسلامیہ ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔ یہ بات اپنی جگہ بالکل صحیح اور ناقابلِ انکار حقیقت ضرور ہے، مگر ہمارے حالات و واقعاتِ دنیا کو اس کے خلاف یہ دکھلا رہے ہیں کہ یہ اُمت ایک ناقابلِ اجتماع تشتت ہے۔ اپنے حالات و خصوصیاتِ وقت سے صرفِ نظر کر کے مسئلہ کے دلائل پر بحث ایک نرا فلسفہ ہے جس سے ہماری کوئی ضرورت پوری نہیں ہوتی۔ اس لیے مجھے اس مسئلہ کے مثبت پہلو پر کچھ کلام کرنے سے زیادہ اس کے منفی پہلو افتراق و تشتت اور اس کے اسباب پر غور اور اس کے علاج کی فکر کرنا ہے۔

جہاں تک اسلام کی دعوتِ اتحاد اور تمام دنیا کے مسلمانوں کو بلکہ کل انسانوں کو ایک قوم، ایک خاندان اور ایک برادری قرار دینے کا معاملہ ہے، وہ کوئی ایسی چیز نہیں جو کسی مسلمان پر مخفی ہو۔ قرآن کریم کے واضح الفاظ: ﴿خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ﴾ میں تمام بنی نوع اور بنی آدم انسان کو، ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ﴾ میں مسلمانوں کو ایک برادری قرار دیا گیا۔

حجۃ الوداع

حجۃ الوداع کے آخری خطبہ میں رسول کریم ﷺ نے جو اُس وقت کے مسلمانوں کے سب سے بڑے اجتماع میں ہدایتی اصول ارشاد فرمائے ان میں اس بات کو بڑی اہمیت سے ذکر فرمایا کہ:

> ”اسلام میں کالے گورے، عربی عجمی وغیرہ کا کوئی امتیاز نہیں۔ سب ایک ماں باپ سے پیدا ہونے والے افراد ہیں۔“

اس ارشاد کے ذریعے جاہلانہ وحدتیں جو نسب اور خاندان کی بنیاد پر یا وطن اور رنگ اور زبان کی بنیاد پر لوگوں نے قائم کر لی تھیں، ان سب کے بُتوں کو توڑ کر صرف خدا پرستی اور دین کی وحدت کو قائم فرمایا۔

یہی وہ حقیقی وحدت ہے جو مشرق و مغرب کے تمام بنی آدم اور نوع انسان کے تمام افراد کو متحد کر کے ایک قوم اور ایک برادری بنا سکتی ہے اور سعی و عمل کے ذریعہ حاصل کی جا سکتی ہے۔ نسب اور وطن یا رنگ اور زبان کی بنیاد پر جو وحدتیں اہل جاہلیت نے قائم کر لی تھیں اور آج کی مزعومہ روشن خیالی کے دور میں پھر انہی کی پرستش کی جا رہی ہے ان وحدتوں کی بنیاد پر ہی انسانوں کے طبقات میں تفرقہ ہے اور تفرقہ بھی ایسا جس کو کسی عمل اور کوشش سے مٹایا نہیں جا سکتا۔ جو کالا ہے وہ گورا نہیں بن سکتا، جو نسب میں سید یا شیخ نہیں وہ کسی سعی و عمل سے شیخ یا سید نہیں بن سکتا۔

اسلام نے ایک ایسی وحدت کی طرف دعوت دی جس میں تمام انسانی افراد بلا کسی مشقت کے شریک ہو سکتے ہیں، اور یہ وحدت چونکہ ایک مالک حقیقی وحدہٗ لاشریک لہٗ کے تعلق اور اس کی اشاعت سے وابستہ ہے، اس لیے بلاشبہ ناقابلِ تقسیم ہے۔

جو عنوان اس مجلس میں مجھے دیا گیا ہے اس کے مثبت پہلو پر تو اتنی گزارش بھی کافی سمجھتا ہوں۔ مگر اب یہ دیکھتا ہوں کہ یہ ایک عقیدہ اور نظریہ ہے جو زبانوں پر جاری اور کتابوں میں لکھا ہوا ہے، لیکن جب اپنے گردوپیش ہی نہیں، بلکہ مشرق و مغرب کے انسانوں کے حالات کا جائزہ لیا جائے تو اس کے برعکس یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ ملت ایک تفرقہ ہے، جس میں اجتماع کا امکان دُور دُور نہیں۔ وہ ملت جس نے دنیا کے تمام انسانوں کو ایک خدا کی اطاعت پر جمع کر کے ایک برادری بنانے کی دعوت دی تھی:

﴿يَـٰٓأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ﴾ (النساء: ۱)

اور پھر مسلسل دعوت اور افہام و تفہیم کے باوجود لوگ اس برادری سے کٹ گئے، ان کو ایک جداگانہ قوم قرار دے کر خدا تعالیٰ کے ماننے والوں کو حسبِ دستور ایک قوم، ایک ملت اور ایک برادری بنا کر بنیانِ مرصوص، سیسہ پلائی ہوئی ناقابل شکست دیوار بنایا تھا، آج وہ ملت ہی طرح طرح کے تفرقوں میں مبتلا، ایک دوسرے سے بیزار اور برسرِ پیکار نظر آتی ہے۔ اس میں سیاسی پارٹیوں کے جھگڑے، نسبتی برادریوں کی تفریق، پیشوں اور کاروبار کی تقسیم اور امیر غریب کا تفرقہ تو بنیادِ منافرت تھی ہی، زیادہ افسوس اس کا ہے کہ دین اور خدا پرستی غیروں کو اپنا بنانے اور نسبی، نسلی، وطنی اور لسانی تفرقوں کو مٹانے ہی کا نسخۂ اکسیر تھا، آج وہ بھی ہمارے لیے جنگ و جدل، عداوتوں اور جھگڑوں کا ذریعہ بن گیا، جس نے پوری ملت کو دینی و دُنیوی ہر اعتبار سے ہلاکت کے غار میں دھکیل دیا اور اس سے بچنے کا کوئی علاج نظر نہیں آ رہا۔ ہماری ہر تنظیم تفریق اور ہر اجتماع افتراق کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ اور یہی وہ روگ ہے جس نے ملتِ اسلامیہ کو اس عظیم الشان عددی اکثریت کے باوجود پسماندہ بنایا ہوا ہے۔ ہر قوم ہمیں اپنے میں جذب کرنے کی طمع رکھتی ہے۔ مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبہ پر عقائد سے لے کر اعمال و اخلاق تک، ثقافت و معاشرت سے لے کر معاملات و اقتصادیات تک ہر قوم کی یلغار ہے۔ ایک طرف حکومت و اقتدار اور اقتصادیات و تجارت میں ان پر عرصۂ حیات تنگ کیا جا رہا ہے تو دوسری طرف ملحدانہ تلبیسات کے ذریعہ ان کے عقائد و نظریات کو متزلزل اور ان کی خدا پرستی کے اصول کو نئی تعلیم و تہذیب اور خیر خواہی اور ہمدردی کے عنوان سے ہوا پرستی میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ ہمارے عوام انگریز کے ڈیڑھ سو سالہ دورِ اقتدار میں مختلف تدبیروں کے ذریعہ علم دین سے محروم اور حقائق سے ناآشنا کر دیے گئے، اب گھر کی دولت علم و فکر گنوا کر جو کچھ دوسروں کی طرف سے آتا ہے، اسی کو سرمایۂ سعادت

سمجھنے لگے، خصوصاً جب کہ اس تعلیم وتہذیب کے سایہ میں نفس کی بے لگام خواہشات اور عیش وعشرت کا میدان بھی کھلا نظر آتا ہے، اور ہمارے علماء اہل فکر ونظر اپنے جزوی اور فروعی اختلافات اور بہت سے غیر ضروری مسائل میں ایسے اُلجھ گئے کہ ان کو اسلام کی سرحدوں پر ہونے والی یلغار کی گویا خبر ہی نہیں۔

اسبابِ مرض اور علاج

آج کی اس مجلس میں ملت کا درد رکھنے والے علماء، فضلاء اور مفکرین کا اجتماع نظر آتا ہے، دل چاہتا ہے کہ ملت کے اس مرض کے اسباب اور اس کے علاج پر کچھ غور کیا جائے۔

امیرؔ! جمع ہیں احباب دردِ دل کہہ لے
پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے!

سب سے پہلے مَیں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ نظری مسائل میں آراء کا اختلاف نہ مضر ہے، نہ اس کے مٹانے کی ضرورت ہے اور نہ مٹایا جاسکتا ہے۔ اختلافِ رائے نہ وحدتِ اسلامی کے منافی ہے نہ کسی کے لیے مضر، بلکہ اختلاف رائے ایک فطری اور طبعی امر ہے، جس سے نہ کبھی انسانوں کا کوئی گروہ خالی رہا، نہ رہ سکتا ہے۔ کسی جماعت میں ہر کام اور ہر بات میں مکمل اتفاقِ رائے صرف دو صورتوں میں ہوسکتا ہے، ایک یہ کہ ان میں کوئی سوجھ بوجھ والا انسان نہ ہو جو معاملہ پر غور کر کے کوئی رائے قائم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، اس لیے ایسے مجمع میں ایک شخص کوئی بات کہہ دے تو دوسرے سب اس پر اس لیے اتفاق کر سکتے ہیں کہ ان کے پاس کوئی رائے اور بصیرت ہی نہیں۔ دوسرے اس صورت میں مکمل اتفاقِ رائے ہوسکتا ہے کہ مجمع کے لوگ ضمیر فروش اور خائن ہوں کہ ایک بات کو غلط اور مضر جانتے ہوئے محض دوسروں کی رعایت سے اختلاف کا اظہار نہ کریں۔ اور جہاں عقل بھی ہو اور دیانت بھی یہ ممکن نہیں کہ ان میں اختلافِ رائے نہ ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ اختلافِ رائے عقل و دیانت سے پیدا ہوتا ہے، اس لیے اس کو اپنی ذات کے اعتبار سے مذموم نہیں کہا جاسکتا۔ اور اگر حالات ومعاملات کا صحیح جائزہ لیا جائے تو اختلافِ رائے اگر اپنی حدود کے اندر ہے تو وہ کبھی کسی قوم و جماعت کے لیے مضر نہیں ہوتا، بلکہ بہت سے مفید نتائج پیدا کرتا ہے۔ اسلام میں مشورہ کی تکریم اور تاکید فرمانے کا یہی منشاء ہے کہ معاملہ کے متعلق مختلف پہلو اور مختلف آراء سامنے آجائیں تو فیصلہ بصیرت کے ساتھ کیا جاسکے۔ اگر اختلافِ رائے مذموم سمجھا جائے تو مشورہ کا فائدہ ہی ختم ہو جاتا ہے۔

صحابہؓ وتابعینؒ میں اختلافِ رائے اور اس کا درجہ

انتظامی اور تجرباتی امور میں تو اختلافِ رائے خود رسول کریم ﷺ کے عہدِ مبارک میں آپ ﷺ کی مجلس میں بھی ہوتا رہا اور خلفائے راشدین اور عام صحابہ کرام j کے عہد میں امورِ انتظامیہ کے علاوہ جب نئے نئے حوادث اور شرعی مسائل سامنے آئے، جن کا قرآن وحدیث میں صراحتاً ذکر نہ تھا یا قرآن کی ایک آیت کا دوسری آیت سے یا ایک حدیث کا دوسری حدیث سے بظاہر تعارض نظر آیا اور ان کو قرآن وسنت کی نصوص میں غور کر کے تعارض کو رفع کرنے اور شرعی

مسائل کے استخراج میں اپنی رائے اور قیاس سے کام لینا پڑا تو ان میں اختلافِ رائے ہوا، جس کا ہونا عقل و دیانت کی بنا پر ناگزیر تھا۔

اذان اور نماز جیسی عبادتیں جو دن میں پانچ مرتبہ میناروں اور مسجدوں میں ادا کی جاتی ہیں، ان کی بھی جزوی کیفیات میں اس مقدس گروہ کے افراد کا خاصا اختلاف نظر آتا ہے، اور اس کے اختلافِ رائے پر باہمی بحث و مباحثہ میں بھی کوئی کمی نظر نہیں آتی۔ ایسے ہی غیر منصوص یا مبہم معاملات حلال و حرام، جائز و ناجائز میں بھی صحابہ کرام j کی آراء کا اختلاف کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں۔ پھر صحابہ کرام j کے شاگرد حضراتِ تابعین کا یہ عمل بھی ہر اہلِ علم کو معلوم ہے کہ ان میں سے کوئی جماعت کسی صحابی کی رائے کو اختیار کر لیتی تھی اور کوئی ان کے مقابل دوسری جماعت دوسرے صحابی کی رائے پر عمل کرتی تھی، لیکن صحابہؓ و تابعین کے اس پورے خیر القرون میں، اس کے بعد ائمہ مجتہدین اور ان کے پیروؤں میں کہیں ایک واقعہ بھی اس کا سننے میں نہیں آیا کہ ایک دوسرے کو گمراہ یا فاسق کہتے ہوں، یا کوئی مخالف فرقہ اور گروہ سمجھ کر ایک دوسرے کے پیچھے اقتداء کرنے سے روکتے ہوں، یا کوئی مسجد میں آنے والا لوگوں سے یہ پوچھ رہا ہو کہ یہاں کے امام اور مقتدیوں کا اذان و اقامت کے صیغوں میں، قراءتِ فاتحہ اور رفع یدین وغیرہ میں کیا مسلک ہے۔ ان اختلافات کی بنا پر ایک دوسرے کے خلاف جنگ و جدل یا سب و شتم، توہین، استہزاء اور فقرہ بازی کا تو ان مقدس زمانوں میں کوئی تصور ہی نہ تھا۔

امام ابن عبدالبر قرطبی نے اپنی کتاب ’’جامع بیان العلم‘‘ میں سلف کے باہمی اختلافات کا حال الفاظِ ذیل میں بیان کیا ہے:

> **عن یحییٰ بن سعید قال ما برح اھل الفتویٰ یفتون فیحل ھذا ویحرّم ھذا فلا یریٰ المحرم المحل ھلک لتحلیلہ ولا یریٰ المحل ان المحرم ھلک لتحریمہ** (۱)
>
> ’’یحییٰ بن سعید فرماتے ہیں کہ ہمیشہ اہل فتویٰ فتوے دیتے رہے۔ ایک شخص غیر منصوص احکام میں ایک چیز کو حلال قرار دیتا ہے، دوسرا حرام کہتا ہے، مگر نہ حرام کہنے والا یہ سمجھتا ہے کہ جس نے حلال ہونے کا فتویٰ دیا وہ ہلاک اور گمراہ ہو گیا، اور نہ حلال کہنے والا یہ سمجھتا ہے کہ جس نے حرام ہونے کا فتویٰ دیا وہ ہلاک اور گمراہ ہو گیا۔‘‘

اسی کتاب میں نقل کیا ہے کہ حضرت اسامہ بن زیدؓ نے فقیہہ مدینہ حضرت قاسم بن محمدؒ سے ایک مختلف فیہ مسئلہ کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ ان دونوں آراء میں سے آپ جس پر عمل کر لیں کافی ہے، کیونکہ دونوں طرف صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت کا اُسوہ موجود ہے۔

ایک شبہ اور جواب:

یہاں اصولِ دین اور اسبابِ اختلاف سے ناواقف لوگوں کو یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ شریعت اسلام میں ایک چیز حلال بھی ہو اور حرام بھی ہو، جائز بھی ہو اور ناجائز بھی ہو۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں میں سے ایک غلط اور ایک صحیح

ہو گی، پھر دونوں جانب کا یکساں احترام کیسے باقی رہ سکتا ہے؟ جس کو ایک آدمی غلط سمجھتا ہے اس کو غلط کہنا عین دیانت ہے۔ جواب یہ ہے کہ کلام مطلق حلال و حرام اور جائز و ناجائز میں نہیں، کیونکہ قرآن و سنت کے منصوصات اور تصریحات کے اعتبار سے کچھ چیزیں واضح طور پر حرام ہیں۔ جیسے سود، شراب، جوا، رشوت وغیرہ۔ ان میں دو رائے نہیں ہوسکتیں اور سلف صالحین کا ان میں کہیں اختلاف ہوسکتا تھا؟ اور ان میں اختلاف کرنا تو دین کے بینات اور واضح نصوص کا انکار کرنا بہ اتفاقِ اُمت گمراہی اور الحاد ہے، اور جو ایسا کرے اس سے بیزاری اور براءت کا اعلان کرنا عین تقاضائے ایمان ہے۔ اس میں رواداری ممنوع ہے۔

یہ رواداری کی تلقین اور اختلاف رائے کے باوجود اپنے مخالف کی رائے کا احترام صرف ایسے مسائل میں ہے جو یا تو قرآن و سنت میں صراحتاً مذکور نہیں، یا مذکور ہیں مگر ایسے اجمال یا ابہام کے ساتھ کہ ان کی تشریح و تفسیر کے بغیر ان پر عمل نہیں ہوسکتا، یا دو آیتوں یا دو روایتوں میں بظاہر کچھ تعارض نظر آتا ہے۔ ان سب صورتوں میں مجتہد عالم کو قرآن و سنت اور تعاملِ صحابہ وغیرہ میں غور و فکر کر کے یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ اس کا منشاء اور مفہوم کیا ہے اور اس سے کیا احکام نکلتے ہیں؟ اس صورت میں ممکن ہے کہ ایک عالم مجتہد اصولِ اجتہاد کے مطابق قرآن و سنت اور تعامل صحابہؓ وغیرہ میں غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ فلاں کام جائز ہے اور دوسرا عالم مجتہد اِن ہی اصولوں میں پورا غور و فکر کر کے اس کے ناجائز ہونے کو صحیح سمجھے۔ ایسی صورت میں یہ دونوں اللہ تعالیٰ کے نزدیک اجر و ثواب کے مستحق ہیں، کسی پر کوئی عتاب نہیں۔ جس کی رائے اللہ تعالیٰ کے نزدیک صحیح ہے اس کو دوہرا اجر و ثواب اور جس کی صحیح نہیں اس کو ایک اجر ملے گا۔ اسی سے بعض اہل علم کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اجتہادی اختلافات میں دونوں متضاد قول حق و صحیح ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بے نیاز ہیں، تمام احکام، عبادات و معاملات سے اللہ تعالیٰ کا مقصود کوئی خاص کام نہیں، بلکہ بندوں کی اطاعت شعاری کا امتحان ہے۔ جب دونوں نے اپنی اپنی غور و فکر اور قوتِ اجتہاد شرائط کے ساتھ خرچ کر لی تو دونوں اپنا فرض ادا کر چکے۔ دونوں صحیح جواب ہیں، مگر جمہور اُمت اور ائمہ مجتہدین کی تحقیق یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تو ان دونوں میں سے کوئی ایک حق و صحیح ہوتا ہے، تو جو لوگ اپنے اجتہاد سے اس حق کو پالیں وہ ہر حیثیت سے کامیاب اور دوہرے اجر کے مستحق ہیں، اور جو مقدور بھر کوشش کے باوجود اس حق تک نہ پہنچیں تو معذور ہیں، ان پر کوئی ملامت نہیں، بلکہ ان کے سعی و عمل کا ایک اجر اُن کو بھی ملتا ہے۔

ایک اہم واقعہ، اہم نکتہ:

ایک اہم واقعہ بھی آپ کے گوش گزار کروں جو اہم بھی ہے اور عبرت خیز بھی۔ قادیان میں ہر سال ہمارا جلسہ ہوا کرتا تھا اور سیّدی حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحبؒ بھی اس میں شرکت فرمایا کرتے تھے۔ ایک سال اسی جلسہ پر تشریف لائے، میں بھی آپ کے ساتھ تھا۔ ایک صبح نماز فجر کے وقت اندھیرے میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ حضرت سر پکڑے ہوئے بہت مغموم بیٹھے ہیں۔ میں نے پوچھا: حضرت کیسا مزاج ہے؟ کہا ہاں! ٹھیک ہی ہے، میاں مزاج کیا پوچھتے ہو، عمر ضائع کر دی۔

میں نے عرض کیا حضرت! آپ کی ساری عمر علم کی خدمت میں، دین کی اشاعت میں گزری ہے۔ ہزاروں آپ کے شاگرد علماء ہیں، مشاہیر ہیں، جو آپ سے مستفید ہوئے اور خدمتِ دین میں لگے ہوئے ہیں، آپ کی عمر اگر ضائع ہوئی تو پھر کس کی عمر کام میں لگی؟

فرمایا: میں تمہیں صحیح کہتا ہوں: عمر ضائع کر دی! میں نے عرض کیا: حضرت بات کیا ہے؟

فرمایا: ہماری عمر کا، ہماری تقریروں کا، ہماری ساری کدوکاوش کا خلاصہ یہ رہا ہے کہ دوسرے مسلکوں پر حنفیت کی ترجیح قائم کر دیں، امام ابوحنیفہؒ کے مسائل کے دلائل تلاش کریں۔ یہ رہا ہے محور ہماری کوششوں کا، تقریروں کا اور علمی زندگی کا!

اب غور کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ کس چیز میں عمر برباد کی؟ ابوحنیفہؒ ہماری ترجیح کے محتاج ہیں کہ ہم ان پر کوئی احسان کریں؟ ان کو اللہ تعالیٰ نے جو مقام دیا ہے وہ مقام لوگوں سے خود اپنا لوہا منوائے گا، وہ تو ہمارے محتاج نہیں۔

اور امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور احمد بن حنبلؒ اور دوسرے مسالک کے فقہاء جن کے مقابلے میں ہم یہ ترجیح قائم کرتے آئے ہیں، کیا حاصل ہے اس کا؟ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم زیادہ سے زیادہ اپنے مسلک کو ''صواب محتمل الخطا (درست مسلک جس میں خطا کا احتمال موجود ہے) ثابت کر دیں اور دوسرے کے مسلک کو ''خطا محتمل الصواب'' (غلط مسلک جس کے حق ہونے کا احتمال موجود ہے) کہیں۔ اس سے آگے کوئی نتیجہ نہیں ان تمام بحثوں، تدقیقات اور تحقیقات کا، جن میں ہم مصروف ہیں۔

پھر فرمایا: ارے میاں! اس کا تو کہیں حشر میں بھی راز نہیں کھلے گا کہ کون سا مسلک صواب تھا اور کون سا خطا۔ اجتہادی مسائل صرف یہی نہیں کہ دنیا میں ان کا فیصلہ نہیں ہوسکتا، دنیا میں بھی ہم تمام تر تحقیق و کاوش کے بعد یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی صحیح، یا یہ کہ یہ صحیح ہے لیکن احتمال موجود ہے کہ یہ خطا ہو، اور وہ خطا ہے اس احتمال کے ساتھ کہ صواب ہو۔ دنیا میں تو یہ ہے ہی، قبر میں بھی منکر نکیر نہیں پوچھیں گے کہ رفع یدین حق تھا یا ترکِ رفع یدین حق تھا؟ آمین بالجہر حق تھی یا بالسر حق تھی؟ برزخ میں بھی اس کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا اور قبر میں بھی یہ سوال نہیں ہوگا۔

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے الفاظ یہ تھے:

اللہ تعالیٰ شافعی کو رسوا کرے گا نہ ابوحنیفہ کو نہ مالک کو نہ احمد بن حنبل کو، جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے علم کا انعام دیا ہے، جن کے ساتھ اپنی مخلوق کے بہت بڑے حصے کو لگا دیا ہے، جنہوں نے نورِ ہدایت چار سو پھیلایا ہے، جن کی زندگیاں سنت کا نور پھیلانے میں گزریں، اللہ تعالیٰ ان میں سے کسی کو رسوا نہیں کرے گا کہ وہاں میدانِ محشر میں کھڑا کر کے یہ معلوم کرے کہ ابوحنیفہ نے صحیح کہا تھا، یا شافعی نے غلط کہا تھا، یا اس کے برعکس، یہ نہیں ہوگا!

تو جس چیز کو نہ دنیا میں کہیں نکھرنا ہے، نہ برزخ میں اور نہ محشر میں، اسی کے پیچھے پڑ کر ہم نے اپنی عمر ضائع کر دی، اپنی قوت صرف کر دی اور جو صحیح اسلام کی دعوت تھی، مجمع علیہ اور سبھی کے مابین جو مسائل متفقہ تھے، اور دین کی جو ضروریات سبھی کے نزدیک اہم تھیں، جن کی دعوت انبیاء کرامؑ لے کر آئے تھے، جن کی دعوت کو عام کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا تھا، اور وہ

منکرات جن کو مٹانے کی کوشش ہم پر فرض کی گئی، آج یہ دعوت تو نہیں دی جا رہی۔ یہ ضروریاتِ دین تو لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو رہی ہیں اور اپنے واغیار ان کے چہرے کو مسخ کر رہے ہیں۔ اور وہ منکرات جن کو مٹانے میں ہمیں لگے ہونا چاہیے تھا، وہ پھیل رہے ہیں، گمراہی پھیل رہی ہے، الحاد آ رہا ہے، شرک و بت پرستی چلی آ رہی ہے، حرام وحلال کا امتیاز اٹھ رہا ہے، لیکن ہم لگے ہوئے ہیں ان فرعی وفروعی بحثوں میں!

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا: یوں غمگین بیٹھا ہوں اور محسوس کر رہا ہوں کہ عمر ضائع کر دی۔

سلف صالحین میں اختلاف ہو تو لوگوں کو کیا کرنا چاہیے؟:

ایسے ہی اختلاف کے متعلق جس میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی دو رائیں ہوں، امامِ اعظم ابوحنیفہؒ نے فرمایا:

احد القولین خطأ والاثم فیه موضوع (۲)

”متضاد اقوال میں سے ایک خطا ہے، مگر اس خطا کا گناہ معاف کر دیا گیا ہے“۔

اور امام مالکؒ سے صحابہ کرام j کے باہمی اختلافات کے متعلق سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا:

خطأ وصواب فانظر فی ذٰلک (۳)

”ان میں بعض خطا ہیں، بعض صواب وصحیح، تو عمل کرنے والے اہل اجتہاد کو غور کر کے کوئی جانب متعین کرنا چاہیے۔“

امام مالکؒ نے اپنے اس ارشاد میں جس طرح یہ واضح کر دیا کہ اختلافِ اجتہادی میں ایک جانب صواب وصحیح اور دوسری جانب خطا ہوتی ہے، دونوں متضاد چیزیں صواب نہیں ہوتیں، اسی طرح یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اس اختلاف و خطا دونوں میں باہم جھگڑا اور جدال جائز نہیں۔ صرف اتنا کافی ہے کہ جس کو خطا پر سمجھتا ہے، اس کو نرمی اور خیر خواہی سے خطا پر متنبہ کر دے۔ پھر وہ قبول کرے تو بہتر ورنہ سکوت کرے۔ جدال اور جھگڑا یا بدگوئی نہ کرے۔

حضرت امامؒ کے ارشاد کا پورا متن یہ ہے:

کان مالک یقول المراء والجدال فی العلم یذهب بنور العلم من قلب العبد، وقیل له رجل له علم بالسّنة فهو یجادل عنها، قال ولکن لیخبر بالسنة فان قبل منه والاسکت (٤)

”حضرت امام مالکؒ نے فرمایا کہ علم میں جھگڑا اور جدال نورِ علم کو انسان کے قلب سے نکال دیتا ہے۔ کسی نے عرض کیا کہ ایک شخص جس کو سنت کا علم حاصل ہے، کیا وہ حفاظتِ سنت کے لیے جدال کر سکتا ہے؟ فرمایا کہ نہیں! بلکہ اس کو چاہیے کہ مخاطب کو صحیح بات سے آگاہ کر دے، پھر وہ قبول کر لے تو بہتر ہے ورنہ سکوت اختیار کرے۔ (نزاع وجدال سے پرہیز کرے۔)“

محمد بن عبدالرحمٰن صیرفیؒ نے حضرت امام احمد بن حنبلؒ سے سوال کیا کہ جب کسی مسئلہ میں صحابہ کرامؓ باہم مختلف ہوں

تو کیا ہمارے لیے یہ جائز ہے کہ ہم ان میں غور وفکر کر کے یہ فیصلہ کریں کہ ان میں صحیح صواب کس کا قول ہے؟ تو فرمایا:

لا یجوز النظر بین اصحاب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم

”رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کے اختلاف میں لوگوں کو غور وفکر ہی نہ کرنا چاہیے۔“

صیرفیؒ نے کہا کہ پھر عمل کس کے قول پر اور کس طرح کریں؟

تقلّد ایھم شئتَ (٥) ”ان میں سے جس کا چاہو اتباع کرلو۔ (یہی کافی ہے۔)“

ائمہ مجتہدین کے ان اقوال میں ابوحنیفہ اور مالک رحمہما اللہ کا مسلک تو یہ ہوا کہ جب صحابہ کرامؓ کا باہم کسی مسئلہ میں اختلاف ہو تو بعد کے فقہاء کو چاہیے کہ دلائل میں غور کر کے جس کا قول سنت سے زیادہ قریب تر سمجھیں اس کو اختیار کرلیں، اور امام احمدؒ کے نزدیک اس کی بھی ضرورت نہیں، دونوں طرف جب صحابہؓ ہیں تو جس کا قول چاہے اختیار کر سکتے ہیں۔

حضرت اُبی بن کعبؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ میں ایک مسئلہ میں باہمی اختلاف ہو رہا تھا۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے سنا تو غضب ناک ہو کر باہر تشریف لائے اور فرمایا کہ ”افسوس! رسول اللہ ﷺ کے اصحاب میں ایسے دو شخص باہم جھگڑ رہے ہیں جن کی طرف لوگوں کی نظریں ہیں اور جن سے لوگ دین کا استفادہ کرتے ہیں۔“ پھر ان دونوں کے اختلافات کا فیصلہ اس طرح فرمایا: **صدق اُبیّ ولم یأل ابن مسعود** یعنی ”صحیح بات تو اُبی بن کعبؓ کی ہے مگر اجتہاد میں کوتاہی ابن مسعودؓ نے بھی نہیں کی“۔ پھر فرمایا کہ ”مگر میں آئندہ ایسے مسائل میں جھگڑا کرتا ہوا کسی کو نہ دیکھوں، ورنہ اتنی سزا دوں گا“۔ (٦)

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد سے ایک تو یہ بات ثابت ہوئی کہ اجتہادی مسائل و اختلافات میں ایک قول صواب وصحیح ہوتا ہے، اور دوسرا اگرچہ صواب نہیں مگر ملامت اس پر بھی نہیں کی جاسکتی۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ ایسے اجتہادی مسائل میں خلاف واختلاف پر زیادہ زور دینا مقتدایانِ اہل علم کے لیے مناسب نہیں، جس سے ایک دوسرے پر ملامت یا نزاع وجدال کے خطرات پیدا ہو جائیں۔

امام شافعیؒ کے ایک مفصل کلام کو نقل کر کے ابن عبدالبرؒ نے فرمایا کہ امام شافعیؒ کے اس کلام میں اس کی دلیل موجود ہے کہ مجتہدین کو آپس میں ایک دوسرے کا تخطیہ نہ کرنا چاہیے۔ یعنی ان میں کوئی ایک دوسرے کو یہ نہ کہے کہ آپ غلطی اور خطا پر ہیں۔ (٧) وجہ یہ ہے کہ ایسے اجتہادی مسائل میں کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اپنے قول کو یقینی طور پر صواب وصحیح اور دوسرے کے قول کو یقینی طور پر خطا وغلط کہے۔ اجتہاد اور پورے غور وفکر کے بعد بھی جو رائے قائم کی ہے اس کے متعلق اس سے زیادہ کہنے کا کسی کو حق نہیں کہ رائے صحیح وصواب ہے، مگر احتمال خطا اور غلطی کا بھی ہے اور ہوسکتا ہے کہ دوسرے کا قول صحیح وصواب ہو۔

خلاصہ یہ کہ اجتہادی اختلافات میں جمہور علماء کے نزدیک علم الٰہی کے اعتبار سے دو مختلف آراء میں سے حق تو کوئی ایک ہی ہوتی ہے، مگر اس کا متعین کرنا کہ ان میں سے حق کیا ہے، اس کا یقینی ذریعہ کسی کے پاس نہیں، دونوں طرف خطا و صواب کا احتمال دائر ہے۔ مجتہد اپنے غور وفکر سے کسی ایک جانب کو راجح قرار دے کر عمل کے لیے اختیار کرلیتا ہے۔

جاری ہے